بابر حسین
پی ایچ۔ڈی سکالر
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

فطرت نگاری حقیقت نگاری کی توسیع

The article discusses the notion of depiction of nature as an extension of realism. Endeavours are made to depict the true picture of life without giving any moral judgement as a conclusion. Its traits are found from the end of the 19th century in France. Depicting nature was for the first time introduced in that era. Apart from didactic works discussion and open expression of individual and social evils were stated. Starting from Europe, it also affected the subcontinent literature and Manto, Chughtai, etc rose to be some of the greatest flagbearers of showing true nature in the garb of realism. Mostly conventional taboos are keep under emphasis in this school of thought.

سولہویں صدی میں مغرب پھر سے احیائے علوم کی طرف متوجہ ہوا۔ مسلمانوں کے علمی ورثہ یونانی ادب اور رومن کلاسیک سے لے کر خود اپنے ہاں زندگی اور کائنات پہ غور وفکر کے انداز میں تبدیلی آئی اور روایتی مقدس حکایتوں کی جگہ منطق، استدلال اور سائنس نے لینا شروع کی۔ پھر ثابت ہوا کہ زمین مرکز کائنات نہیں بلکہ کائنات میں محض ایک معمولی سیارہ ہے۔ دنیا جہاں کے علوم پہ کام شروع ہوا تو علم وادب کو فروغ ملا۔ نئے براعظم دریافت ہوئے۔ صنعتی اور زراعتی آلات میں جدت آنا شروع ہوئی تو علم وادب کے روایتی انداز اور موضوعات بھی بدلنا شروع ہوئے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی معاشرے میں اکثر تحریکیں اٹھارویں سے بیسویں صدی کے درمیان ابھرنا شروع ہوئیں۔ کلاسیکیت، رومانویت، عقلیت، وجودیت، علامت، نفسیات سے نجانے کتنے سیاسی، ثقافتی اور معاشی رجحانات علمی وادبی تحریکوں میں ڈھلتے گئے۔ تحریکیں اٹھیں اور اپنے حصے کا اچھا برا تاثر دے کر سماج بالخصوص علم وادب کو

متاثر کر کے اسی سماج اور اسی علم وادب میں تحلیل ہوتی گئیں۔ انہی تحریکوں میں سے ایک تحریک فطرت نگاری ہے برطانوی انسائیکلوپیڈیا میں فطرت نگاری کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

In literature, it extended the tradition of Realism aiming at an even more faithful representation of reality a veritable slice of life presented without moral judgment. (1)

ادبی اصطلاحات میں فطرت نگاری (Realism) کی تعریف یہ ہے:

"بطور اصطلاح اور ادبی تحریک کے فطرت نگاری سے دو صورتیں مراد ہیں۔اول خارجی مظاہر میں پھیلے ہوئے جمال وجلال کی سچی تصویر کشی اور دوم انسانی سرشت میں موجود تمام جبلتوں، احساسات وجذبات اور فکر وخیال کی آزادانہ عکاسی۔"(۲)

مختلف بغاوت اور تفہیمی کتب کے مطالعے کے بعد ہم فطرت نگاری کی یہ تعریف کر سکتے ہیں:

حقیقت پسندانہ مناظر یا خیالات کو تفصیل سے پیش کرنے کا نظریہ یا عمل 'فطرت نگاری' ہے۔ ایک فطرت نگار حقیقت پسند ہوتا ہے اور مادی فلسفے یا غیر محسوس مقدس نظام اخلاق یا مذہبی روایات سے روگردانی میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔

انیسویں صدی کے اختتام پر فرانس میں مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر میں فطری بد اخلاقی اور بد صورتی کو ادب کا موضوع بنانے کا رجحان پروان چڑھا۔ فطرت نگاری کے اس باقاعدہ رجحان سے پہلے 'خیر' کو پرکشش جبکہ 'شر' کو حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ فطرت نگاروں نے پہلی بار انسانی فطرت کے اچھے برے گوشوں کو بے نقاب کیا اور فکری مشاہدہ اور ادبی مہارت کے ساتھ ان ستم ظریفوں کو قارئین کے سامنے لایا۔

انسان کی جبلی خامیوں اور فطری کمزوریوں کو اعتماد بلکہ فخر سے سامنے لانے کا یہ رجحان محض ادبی نہیں تھا بلکہ انیسویں صدی کے فرانس میں مروجہ فنون لطیفہ کے تمام شعبوں میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً مصوری، مجسمہ سازی، رقص، ڈرامہ، فائن آرٹس وغیرہ۔

فطرت نگاری کے حوالے سے اردو زبان میں دستیاب تحقیقی مواد میں دو باتیں مشترک ملیں۔

۱۔　حقیقت نگاری کی توسیع ہی دراصل فطرت نگاری ہے۔

۲۔　ادب میں حقیقت نگاری وفطرت نگاری کا باقاعدہ آغاز فرانسیسی ناول نگار فلابیر (۹۔۱۸۸۱ء) کے کلاسیک ناول ''مادام بواری'' کی اشاعت (۱۸۵۷ء) سے ہوا تاہم فرانسیسی ادیبوں ژولا اور موپساں کی فطرت جذباتِ انسانی کی عکاسی نے اسے آگے بڑھایا۔

ادب میں اشیاء، اشخاص اور واقعات کو کسی قسم کے تعصب، تصنع یا رومانویت سے آلودہ کیے بغیر دیانت داری کے ساتھ پیش کیے جانے کا نام حقیقت نگاری ہے۔ اردو لغت میں حقیقت نگاری کی تعریف یہ ہے:

ادب اور مصوری کی ایک مغربی اصطلاح۔ ادب میں زندگی (جیسی کہ وہ ہے) کی سچی تصویر پیش کرنا حقیقت نگاری کہلاتا ہے۔(۳)

انیسویں صدی کے آغاز میں جب چھاپہ خانے پھیلے، صنعتی وزرعی انقلاب آنا شروع ہوا، تو آبادیاتی نظام کی بنیادیں مضبوط ہونا شرع ہوئیں تو علمی وادبی سطح پر مضبوط معاشرتی بالخصوص فرانس اور یورپ میں حقیقت نگاری کی تحریک شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں جب ''گلوبل ویلج'' کی پہلی اینٹ اگرچہ استعماری مصالحہ سے رکھی گئی، لکھنے والوں نے انسان کی انسان سے ملاقات پر سچ لکھنا شروع کیا۔ یہ رجحان عام ہونے لگا کہ حقائق کو اسی طرح پیش کیا جانا چاہیے جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہوتے ہیں۔ محمد حیات خان کے خیال میں:

حقیقت پسند ادیب تخیل کے بجائے حقیقی واقعہ کو ترجیح دیتا ہے اور ماضی کے بجائے حال کے مسائل ومعاملات کو اہم جانتا ہے۔ وہ زندگی کے ایسے کراہت انگیز کوائف ومظاہر کو بھی موضوع بناتا ہے کہ نفاست پسند ادیب، جنھیں قابل اعتنا نہیں جانتے۔ وہ زندگی کو رنگین شیشوں میں سے دیکھنے کے بجائے اپنی ننگی آنکھ سے دیکھتا اور اسے جوں کا توں بیان کرتا ہے۔(۴)

حقیقت نگاری کی تحریک انیسویں صدی کے وسط میں یورپ میں شروع ہوئی اور فلابیر (۹۔۱۸۸۱ء) کے ناول مادام بواری کی اشاعت کے بعد اسے حقیقت نگار ادیبوں میں اولیت کا درجہ دیا جانے لگا۔ اس ناول نے ہی چونکہ حقیقت نگاری کے اگلے زینے فطرت نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ سو ناول کے موضوع کا مطالعہ حقیقت اور فطرت کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

"مادام بواری" ناول میں ایک قصبے کے ایک ڈاکٹر اور اس کی بیوی کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو گھر کی خشک، خاموش اور روکھی پھیکی زندگی سے تنگ آکر ایک ایسے رومانی فریب میں مبتلا ہو جاتی ہے جو اسے مروجہ اخلاقی قدروں سے دور کر کے قائل بہ آوارگی کر دیتا ہے مگر اس بغاوت کے باوجود وہ اطمینان یا خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔مختلف آزمائشوں کے بعد خود کشی کر لیتی ہے۔فلابیر اس ناول میں اپنے کرداروں کے ذریعے اخلاقی قدروں، مذہبی اصولوں، خاندانی روایات اور قانونی اصطلاحات کا مذاق اڑاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ یہ سب منافقت اور دوغلے پن کا مرکب ہیں اور منافقت اور دوغلا پن ہی پیدا کرتی ہیں تاہم ناول کا اسلوب شاندار ہے۔

چندجملوں میں مادام بواری کے موضوع کا احاطہ ممکن نہیں تاہم موضوعاتی جھلک سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت نگار پژمردہ اور بیمار موضوعات کو ناگواری سے ادا کرنے کے بجائے ان پر کھل کر گفتگو کرتا ہے۔

فطرت انسان کو سامنے لانے والا ادیب اچھی یا بری فطرت کا انتخاب نہیں کرتا بلکہ اس کا موضوع ہی "فطری بد اخلاقی" ہوتا ہے۔

فطرت نگاری کا یہ رجحان انیسویں صدی کے وسط میں ناول کے ساتھ ساتھ مصوری، مجسمہ سازی، شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔بالخصوص انیسویں صدی کے وسط میں "ممنوعہ تصاویر" کی نمائش سے "فطرت نگاری" نے باقاعدہ ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

☆ فطرت نگاری سے قبل کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کا منظر نامہ کے بعد اس تحریک سے وابستہ اولیں اور اہم ادیبوں کا تذکرہ۔

- ایملی ژولا (۱۸۴۰ء۔۱۹۰۲ء) فرانس ناول نگار
- بالزاک (۱۷۹۹ء۔۱۸۵۰ء) فرانس ناول نگار
- فلابیر (۱۸۲۱ء۔۱۸۸۰ء) فرانس ناول نگار
- موپساں (۱۸۵۰ء۔۱۸۹۳ء)
- ہنری جیمز (۱۸۴۳ء۔۱۹۱۶ء) امریکہ، ادیب
- جارج مور (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۸ء) برطانیہ، فلسفی

فطرت نگاری دراصل حقیقت نگاری کی توسیع ہے۔ دونوں کا آغاز فرانس سے ہوا اور تقریباً زمانی حوالہ بھی مشترک ہے تاہم فطرت نگاروں کے خیال میں حقیقت نگار بہت سی ''ممنوعہ'' حقیقتیں چھپا جاتے ہیں۔ چونکہ یہ ناگوار اور تلخ ہیں۔ سو ان کا تذکرہ ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہ ''فطرت انسانی'' ہے سو ایک حقیقت نگار کو فطرت نگار بھی ہونا چاہیے۔

فطرت نگار بہت سے ''مہذب'' حقیقت نگاروں کے مخالف دکھائی دیئے کہ جو جنسی الجھنوں، جسمانی استحصال اور مقدس اداروں اور شخصیات کی ذاتی دہری زندگی کی درندگیوں کو سامنے لانے سے کتراتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب کا تعلق اگر انسانوں سے ہے تو انسانی دل ودماغ اور اس کی آمریت کے سبب پیدا ہونے والے ہر مسئلہ، اس کے محرک امر اس کے مضمرات کا تذکرہ ادب میں آنا چاہیے۔ ممتاز حسین جیسے سنجیدہ تنقید نگار کے خیال میں:

دنیائے فطرت میں مواد جہاں بھی موجود ہے تو لامحالہ اس کی نوعیت بھی موجود ہے۔ یہ ادب کی دنیا کی چیز ہے چنانچہ محبت اور جنس زندگی کے سماجی پہلوئوں کے علاوہ حیاتیاتی پہلوئوں کو بھی فطرت نگاروں نے ادب کا موضوع بنایا ہے۔(۵)

دوم، فطرت نگار ایک اور حوالہ سے بھی حقیقت نگاروں سے مختلف ہو جاتے ہیں کہ جب وہ زندگی کے سامنے کی سچائیوں کے بجائے خفتہ حقیقتوں کا تذکرہ ڈالتے ہیں۔

پریم چند بلاشبہ اردو ادب کا اولیں اور اہم ترین حقیقت نگار ہے بلکہ کئی ایک افسانوں میں فطرت نگاری کا رجحان بھی ملتا ہے۔ تاہم پریم چند کا تعارف حقیقت نگاری ہی ہے۔ اس کا سرمایہ آفاق افسانہ ''کفن'' دراصل غربت زدہ گھرانہ کی کہانی ہے جو گھر کی واحد عورت کے مرنے پہ کفن دفن کے لیے رقم مانگتے ہیں اور اس سے شراب پی جاتے ہیں۔ یہی افسانہ اگر منٹو جیسا فطرت نگار لکھتا تو کفن دفن دینے والے چوہدری کے غریب کی جورو بارے احساسات کا تذکرہ بھی ہوتا، غربت زدہ گھرانہ کی اس عورت کی جنسی استحصال کی بھی کوئی جھلک ملتی اور دوران حمل خاوند، بیوی یا سسر کے ذہن ودل میں پلنے والے کئی ممنوعہ خیالات بھی احاطہ تحریر میں لائے جاتے۔ یوں ''کفن'' کالا کفن بن جاتا۔ کسی بھی جذبے اور تاثر کی آمیزش کے بغیر۔

سوم: دراصل فطرت نگار زندگی کی مشکوک پہلوئوں پہ زیادہ توجہ دیتا ہے کیونکہ ان کے خیال

میں انسان کسی نہ کسی جبر کا شکار ضرور ہے اور مکمل آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہے۔

چہارم: فطرت نگار عظمت آدم کے ویسے قائل نہیں ہیں کہ جس کے لیے فلک برسوں پھرتا ہے۔ان کے خیال میں انسان لاکھوں سال حیوانوں کے ساتھ رہا اور باقی حیوانوں کی طرح وہ بھی ایک حیوان ناطق ہے۔حکمت مصلحت کے مصنوعی اخلاقیات کے بجائے اس میں چھپی حیوانیت کا اعتراف کرنا چاہیے۔مثلاً نفسیاتی خواہشات کی فوری تسکین کے لیے حیوانیت پہ اتر آنا فطرت ہے اور اس کا تذکرہ ہی فطرت نگاری ہے۔سو ان کے خیال میں ایک فطرت نگار ہی اصل حقیقت نگار ہے کہ جو زندگی کی خوبصورتیوں کے ساتھ بدصورتیوں پر بھی توجہ دیتا ہے۔

دوسری طرف فطرت نگاروں پہ معترض ناقدین انھیں یاسیت اور قنوطیت کے علمبردار کہتے ہیں۔مستقلاً فطرت نگاری کرنے والے ادیبوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے برے، بھدے اور اتفاق بدصورت پہلوئوں پر اتنا زور دیتے ہیں کہ زندگی سے محبت اور عظمت کے بجائے ذلت اور ندامت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

دوسرا اعتراض فطرت نگاروں کی ہمت افزائی کے پیغام کے بجائے ناکامی کے اشباء پر ہے۔کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے مسلسل سفر اور نامساعد حالات کے باوجود فطرت، قدرت اور حالات کے سامنے ڈٹے رہنے اور مسلسل آگے بڑھنے کی سرگزشت کو محض چند شہوانی جذبات کے سامنے شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔فطرت نگاروں کا نظریہ ادب یہی ہے کہ ہر انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنے امکانات کو حاصل نہ کر سکے اور صرف محرومیاں، ناکامیاں اور گنجلک کج رویاں لے کر بقول درد اس دنیا سے جائے:

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

مثلاً بیسویں صدی کے وسط میں اردو ادب کے دو اہم ترین فطرت نگاروں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی پر یہ اعتراض رجعت پسندوں سے ہی نہیں۔ترقی پسند ادیبوں نے بھی کیا کہ مذکورہ فطرت نگار اپنی کئی تخلیقات میں حقیقت نگاری کے نام پر محض اس ذہنی وتصوراتی عیاشی یا محرومی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جس کی عمومی مثالیں معاشرہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ایسی ہی فطرت نگاری پہ

عبدالحلیم یوں تنقید کرتے ہیں:

ایسی حقیقت نگاری جو سطحی مصوری پر اکتفا کرے اور جسے فطرت نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہو، اپنے دائرے میں اتنی ہی معیوب ہے جتنی کہ فرضی اور خیالی رومانویت(۲)

فرانسیسی ادب سے فطرت نگاری کی تحریک انگریزی ادب میں آئی اور برطانوی عہد کے برصغیر میں یہ رجحان اردو زبان میں داخل ہوا۔ شاعری میں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی ابتدائی جھلکیاں نظیر اکبر آبادی کے ہاں دکھائی دیتی ہیں جبکہ بعد میں غالب، مومن اور ذوق وغیرہ شعری موضوعات اور اسالیب کو حقیقت اور فطرت کے مطابق لانے کی کوشش کرتے رہے۔

ہمارے موضوع میں ''نثری فطرت نگاری'' شامل ہے سو نثر میں فطرت نگاروں کے رجحان کے لیے ہمیں سرسید کی نثر کو دیکھنا پڑے گا جس میں فطرت نگاری کی ابتدائی خام جھلکیاں اور حقیقت نگاری کے بھرپور رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید نے حقیقت کی ایک عظیم الشان تحریک کی پشت بانی بھی کی کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد عقلیت پسندی، مقصدیت پسندی اور جدت طرازی کی اشد ضرورت بھی تھی۔

اردو ادب میں فطرت نگاری کا باقاعدہ رجحان پریم چند کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ برطانوی نو آبادیاتی نظام کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی اثرات، جنگ عظیم اول کی تباہ کاریاں، طبقاتی وغیر مساوی نظام زندگی پر عالمگیر احتجاجی تحریکوں کی بازگشت نے ہندوستانی ادب کو بھی باشعور کرنا شروع کیا اور حقیقت پسندی، عقلیت پسندی اور ترقی پسندی جیسی ہنگامہ خیز نئی ادبی تحریکوں کے جلو میں فطرت نگاری تحریک نہ سہی ایک منفرد رجحان بن کر ضرور آگے بڑھتی رہی۔

محنت اور سرمائے کے غیر متوازن خلیج اور عالمی کشمکش نے ترقی پسند تحریک کو عروج بخشا تو سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور ممتاز مفتی سمیت بیسویں صدی کے وسط میں اکثریتی اردو ادیبوں نے ماضی پرستی، فرقہ پرستی، مذہب پرستی، ہیئت پرستی اور تعصب واستحصال کی سخت مخالفت کی۔ مذکورہ بالا ادیبوں نے حقیقت نگاری سے آگے بڑھ کر فطرت نگاری میں خاص دلچسپی لی۔ اردو فکشن بالخصوص افسانہ میں نفسیاتی الجھنوں، جنسی گھٹن، روحانیت کے اسرار، جذبوں کی شدت اور نیکی بدی کی کشمکش کو کامیابی سے سامنے لایا گیا۔ مرزا حامد بیگ کے خیال

میں:

نفسیاتی الجھنوں میں ابتدائی نام احمد علی، محمد حسن عسکری، منٹو، عزیز احمد، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی کے ہیں۔ عسکری، عصمت اور بیدی نے عورت کے جنسی جذبے کی اٹھان اور بالترتیب کرسچن، مسلم اور ہندو معاشرے میں فطرت نگاری کے تحت جنسی گھٹن کو نمایاں کیا۔ منٹو نے ہیجانی جذبات کی تصویریں پیش کیں۔ عسکری نے طوائف میں ممتا اور نسائیت کو تلاش کیا جبکہ ممتاز مفتی نے براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع کر کے اس طرح کی کج رویوں کے لاشعوری محرکات کو ٹھوس علمی نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ منٹو کی کہانیوں میں بالخصوص ظاہری اور باطنی فطرت نگاری موجود ہے جس نے ان افسانوں کو شاہکار بنا دیا۔[۷]

اب تک کی اس پس منظری گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

۱۔ اردو ادب میں فطرت نگاری تحریک نہیں محض رجحان رہی ہے۔

۲۔ اردو ادب کی نمائندہ ترین فطرت نگار منٹو ہے۔

فطرت نگاری کے اعتبار سے منٹو انفرادی حقائق کا بہترین عکاس ہے۔ وہ نہایت استغنا اور لاپرواہی سے وہ تمام مرقعے الفاظ میں پیش کرتا جو اسے اپنے اردگرد دکھائی دیتے ہیں۔ بقول مرزا حامد بیگ یہ مرقعے اپنے اصل خدوخال اور رنگ روپ میں بہت سے آدمیوں کو پہچانتے تھے۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ جنھیں علم ہی نہ تھا کہ حقیقت کی یہ شکلیں بھی ہو سکتی ہیں اور بیشتر اشخاص تھے کہ جو فطرت نگاری کے ان رنگوں سے بخوبی واقف تھے لیکن مشرق کی وضع داری کے خلاف کسی بات کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں نے منٹو کے فن پر بڑی لے دے کی۔ منٹو نے اپنی فطرت نگاری کی وضاحت یوں کی ہے:

جس دور سے آج ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دور ہی ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو غلطیاں ہیں، وہ اس دور کی غلطیاں ہیں۔ میرے لکھنے میں کوئی برائی نہیں جسے میرے نام کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ وہ دراصل اس دور کی زمانے کی برائی ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا بلکہ سفید چاک استعمال کرتا ہوں تاکہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور زیادہ واضح

ہو جائے۔[۸]

اس اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ فطرت نگاروں کی ایک مختصر کھیپ جو قیام پاکستان کے عرصہ میں سامنے آئی اور اکثریت نے جنس نگاری کو ہی موضوع کیوں بنایا جبکہ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات میں فطرت نگاری محض جنس نگاری کا نام نہیں تھا۔وہاں فرسودہ روایات سے بے زاری، مقدس اقدار سے اکتاہٹ اور فرد کو فرشتے یا شیطان کے بجائے ایک انسان کے طور پر دیکھنے کا نام فطرت نگاری تھا جبکہ اپنے ہاں۔بقول کلیم الدین احمد:

بعض عناصر نے اس تحریک کی آڑ لے کر ادب کو ایسی ڈگر پر موڑ دیا جو تحریک کی اصل نمایت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔[۹]

طوائف، ہم جنسیت، خود لذتی، شہوت نگاری اور ایک مرد کے ایک عورت اور ایک عورت کے ایک مرد کے بارے میں جنسی خیالات کا اظہار اس شدت سے ہونا شروع ہوا کہ ترقی پسندوں نے بہت سے فطرت نگاروں کو اپنی صفوں سے نکالنے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۵ء کے ایک کنونشن میں منٹو، عصمت، عسکری، عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر سمیت کئی اور فطرت نگاروں کے خلاف قرار دادیں پیش کی گئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نصف صدی قبل جس منٹو کو ترقی پسندوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، آج ترقی پسند ادب کی ایک نمائندہ مثال وہی منٹو ہے۔تاہم یہ بھی درست ہے کہ فطرت نگاروں کی ابتدائی اور مرکزی کھیپ نے زیادہ طبع آزمائی جنسی موضوعات پر ہی کی۔

فطرت نگاروں کا اگر یہ موقف درست بھی تسلیم کیا جائے کہ برائی کے خاتمہ کے لیے اسے کریہ صورت میں پیش کیا جانا ضروری ہے تو یہ سوال ضرور جنم لیتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے صرف ایک ایسی پہلو کو ہی مدنظر کیوں رکھا؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فطرت نگار انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کے ابلاغ میں بدطولی رکھتے تھے اور اس عہد میں برصغیر کے عوام جنسی گھٹن اور نفسیاتی رومانوی تشنگی کے سبب جنس پر ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ترقی پسندی، روشن خیالی اور اپنے قارئین کی تعداد میں اضافہ کے لیے جنس نگاری آسان گر تھا۔

اردو ادب کے چند اہم فطرت نگاروں کا تعارف:

۱۔ سعادت حسن منٹو (بو، موزیل، ٹھنڈا گوشت، ہتک)
۲۔ عصمت چغتائی (لحاف)
۳۔ ممتاز مفتی (علی پور کا ایلی، سمے کا بندھن)
۴۔ کرشن چندر
۵۔ راجندر سنگھ بیدی (لاجونتی، گرہن، جوگیا، لمس لڑکی)
۶۔ بلونت سنگھ
۷۔ محمد حسن عسکری (حرام جادی، پھسلن)
۸۔ آغا بابر (باجی ولایت، چالیس ہیجڑا)
۹۔ پریم چند اور قرۃ العین حیدر (جزوی تخلیقات)

اس مختصر بحث کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں فطرت نگاری براہ راست فرانسیسی ادب کے بجائے انگریزی ادب سے آئی اور سگمنڈ فرائیڈ کے نفسیاتی سلوک کے زیر اثر نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کو بھی آفاقی رنگ دے کر بالخصوص افسانے میں پیش کیا۔ فطرت نگاروں کی اکثریت ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے سامنے آئی جنھوں نے فطرت نگاری کی بھیانک تصویر کشی بھی کی جبکہ بعض ادیبوں نے جنسی اور نفسیاتی الجھنوں کے اظہار کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ فطرت نگاری اردو ادب میں باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ البتہ اس رجحان نے موپساں، چیخوف، فرائیڈ وغیرہ کے نظریات کو اردو ادب میں ڈھالا۔ کئی ایسے گوشے جو صنفی، جنسی اور نفسیاتی کج رویوں سے لبریز لاشعور میں چھپے پڑے تھے، فطرت نگاروں نے ہی سب سے پہلے مقدس روایتی نظام اخلاق سے روگردانی کرتے ہوئے انھیں پیش کیا۔ آج اگرچہ فطرت نگاری بطور تحریک یا رجحان کے پھیلتی نہیں دکھاتی۔ تاہم فطرت نگاروں کی اولین اور اہم کھیپ نے اردو اصناف کی موضوعاتی ہیئت کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اب ر صنف ادب میں فطرت نگاری کا شامل ہونا مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔

آخر میں فطرت نگاری کی اس بحث کو پروفیسر انور جمال کے الفاظ میں یوں سمیٹتے ہیں:

بطور اصطلاح اور ادبی تحریک کے فطرت نگاری سے دو صورتیں مراد ہیں۔ اول خارجی مظاہر میں پھیلے ہوئے جمال وجلال کی سچی تصویر کشی۔ دوم انسانی سرشت میں موجود تمام جبلتوں احساسات،

جذبات اور فکر وخیال کی آزادانہ عکاسی!

اور یہ تحریک اپنے منطقی انجام کو کیوں پہنچی، ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے الفاظ میں:

نیچرازم سستی جذباتیت کے خلاف ایک رد عمل کے طور پر اہم تحریک تھی لیکن سائنس اور پرٹ کے جداگانہ منصب کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے یہ تحریک حقیقت نگاری اور واقعات نگاری میں فرق نہ کر سکی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اس کا شدید رد عمل ہوا اور اس بات کو محسوس کیا گیا کہ آدمی کو کلیے، فار مولے، ٹائم ٹیبل اور اصولوں کے ذریعے پیش کرنا فن نہیں، یہ تو حقیقت کو مسخ کر دیتا ہے اور ان نازک احساسات کو نظر انداز کر دیتا ہے جو انسان اور حیوان میں فرق پیدا کرتی ہے اور جو انسان کی سطح حیوان سے بلند کرتی ہے... یہ رد عمل جرمنی بالخصوص فرانس میں ہوا۔ چونکہ اس تحریک کا زور فرانس میں ہی تھا اس لیے نیچرل ازم کے خلاف رد عمل کے طور پر ایک دوسری تحریک شروع ہوئی۔ داداالزم نیچرل ازم کے خلاف رد عمل کے طور پر ابھری۔ اس تحریک کے تحت یہ کہا گیا کہ اصل حقیقت وہ نہیں جو ہمیں نظر آتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو ظاہری حقیقت کے پیچھے ہوتی ہے۔[۱۰]

حوالہ جات

۱۔ یوسف حسن، فرانسیسی ادب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۴ء، ص۳۵۱

۲۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فائونڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص:۱۳۷

۳۔ ایضاً، ص:۷۹

۴۔ محمد حیات خان، نقد وادب، الائیڈ بک سینٹر، ۲۰۰۶ء، ص:۱۶۱

۵۔ ممتاز حسین، نئی قدریں، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص۱۴۱

۶۔ عبدالحلیم، مارکسی تنقید (مشمولہ تنقیدی نظریے)، عشرت پبلشنگ ہائوس، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص:۹۹

۷۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص:۸۸۱

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، منٹو کے نمائندہ افسانے، مکتبہ فکر وفن، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۱۷

۹۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فائونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص:۱۳۸

۱۰۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۲۶۷